سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان محبت و خلوص اور ارادت کا ایک تعلق خاص تھا۔ اس حوالے سے کئی تذکروں میں مواد ملتا ہے۔ ذیل میں جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم کی تین کتابوں "مولانا ابوالکلام آزاد"، "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اور "بوئے گل نالۂ دل" کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں اس موضوع پر قلم اٹھا کر بہت سے واقعات کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، ان شاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں مختلف تذکروں، آپ بیتیوں اور سوانحی کتابوں سے مولانا اور شاہ جی کے حوالے سے موجود مواد کو یکجا کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک اور جماعت تھے، ان سے بڑا عوامی خطیب نہ اردو زبان نے پیدا کیا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار ہی نظر آتے ہیں، ان کے کلام و بیان کی تاثیر و سحر کا یہ حال تھا کہ دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلتی اور دماغوں کا انجماد رواں ہو جاتا۔ انہیں ہوا کے جھونکے اور سمندر کی موجیں بھی گونج بر آواز ہو کر سنتی تھیں، ان کا بیان تھا کہ وہ مسجد ہی کے حجرے میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتے تھے اور اس نہج ہی سے ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی لیکن "الہلال و زمیندار" انہیں جدوجہد کے میدان میں لائے اور "ستارۂ صبح" نے ان کے جگر میں آگ لگا دی۔ الہلال کے بارے میں فرمایا۔

> "الہلال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور وہ محرک انسان کی طرح قرن اول کی طرف لوٹ گئے پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے افق پر پرواز کی۔ الہلال نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا اور ان کی کایا کلپ ہو گئی۔ ان کی خطابت کا اسلوب اور اسکے مختلف زاویے الہلال کے مرہون ہیں۔ آزاد..... ان کے ذہنی مرشد تھے۔ ان سے بہت سی ملاقاتوں میں فیضان حاصل کیا، ہر ملاقات علم و نظر کی ایک نئی دریافت ہوتی۔ آزاد جس موضوع پر بولتے، معلوم ہوتا انہیں کا خانہ زاد ہے، انہیں قرآن کی تفسیر میں منفرد پایا، ترجمے میں یکتا، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحر ناپیدا کنار، شاعری کا معدن اور نثر میں رستم و اسفندیار۔

گھنٹوں بولتے لیکن تکرار عنقا، فنون لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔ امام الہند فن موسیقی پر زبان کھولتا تو گلفشانی گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔ "غبارِ خاطر" کا آخری خط ان کے اسی ذوق عظیم کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پر ان کے تشریحی حاشیے لاجواب ہیں، میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کی ایک تقریر سنی ہے، ملک بھر کے نامور مصور جمع تھے اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے۔ سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے، سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء، تہذیب کی تاریخ اس طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر بہ رہی تھیں۔ ایک دن مختلف قوموں کے فواحمات و مشروبات کی طلسم ہوشربا بیان کی تو گفتگو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ ہم حیران تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فواحمات و مشروبات کی جزیات تک سے بھی آشنا ہیں۔ ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع سنا ڈالا، پھر چرند و پرند کی عادتوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہو گیا، کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں، یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے، وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو جانتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے، ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی۔ ایک دن رستم زماں گاماں پہلوان ملنے آ گئے ہم لوگ وہیں تھے، اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دنگ رہ گئے گویا رستم و اسفندیار کے ساتھ ڈنٹر پیلتے رہے ہیں۔ بنوٹ پر گفتگو کی تو پوری کتاب کھہ ڈالی۔ مولانا محمد علی الہ آباد میں سنگم پر کشتی رانی کے لئے چلے گئے واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا، وہ گر بتائے کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آ گئی۔ تمباکو پر روشنی ڈالی تو کہاں سے کہاں نکل گئے۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک اور چھالیہ سے لے کر قوام تک، جانے کیا کچھ بیان کیا۔ ہم ششدر تھے، الہ العالمین ابوالکلام ہیں کہ صحیفہ کائنات۔

ایک دن مختلف ملکوں کی خواتین پر اس شائستگی سے اظہار خیال کیا کہ عباسی عہد کے ان داستان گو عنبریوں کی یاد تازہ ہو گئی جو اس موضوع میں عربی زبان کے بانکپن کی رعایت سے یگانۂ عصر تھے۔ مولانا کے طرزِ کلام کا عظیم پہلو یہ تھا کہ ان کی زبان پر کبھی مبتذل الفاظ نہ آتے، وہ ان الفاظ ہی سے نا آشنا تھے۔ فرماتے رکیک الفاظ مخرب الاخلاق قوموں کا سنڈاس ہوتے ہیں۔"

راقم وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی کے ہمراہ دہلی میں تھا ایک دن وقت لے کر مولانا کے ہاں پہنچے تو اس جلسے کا ذکر آ گیا، جو گئی رات دہلی میں جامع مسجد کے سامنے ہوا تھا اور کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس جلسے میں آئے تھے۔ اور کرپس نے بھی تھوڑی سی دیر جلسے کے بے پناہ ہجوم پر نگاہ کی تھی۔

مولانا نے شاہ جی کی شیوہ بیانی کو سراہتے ہوئے استفسار کیا۔
شاہ صاحب، سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھکا دیتے ہیں۔
شاہ جی نے لاحول پڑھا اور کہا:
حضرت آپ سے کس نے کہا؟
مولانا: کوئی ذکر کر رہا تھا۔
شاہ جی: کون؟
مولانا: میرے بھائی نام تو یاد نہیں رہا لیکن کوئی بیان کر رہا تھا۔ کان میں بھنک پڑی تو تعجب ہوا۔
ہر کسی کا نام نہ تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔
شاہ جی: تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا۔
مولانا: سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے، آپ سے جو تعلق خاطر ہے اسکے باعث معاً وہ چیز یاد آ گئی۔
شاہ جی: "جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے۔"
مولانا: "وہ پھانس اس لئے دماغ میں رہ گئی معاً تحریک خلافت کا زمانہ یاد آ گیا۔ آج سے کوئی چوبیس یا پچیس برس پہلے آپ نے لاہور میں ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے۔ ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے جن میں جل، چل، ٹل قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلوا دی ہو۔ اور شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو
شاہ جی: مولانا! جس شخص نے الہلال پڑھا ہو وہ گالی دے سکتا ہے؟
شاہ جی مسکرائے اور کہا۔
حضرت ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو اب تک یاد ہے۔
فرمایا:
"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں، گو حافظہ ہر طرح کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں سے گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں، وارث شاہ کا کلام تھا آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا"۔
شاہ جی کھلکھلا کر ہنس پڑے، ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مولانا کی زبان سے پنجابی الفاظ اس طرح نکل رہے تھے گویا قاقم پر سنگریزے لڑھک رہیں۔ (۱)
شاہ جی نے صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے متعلق لاہور کے ایک اخبار کا تذکرہ کیا کہ اس کا پورا قبیلہ صوم و صلوٰۃ کا باغی ہے۔ لیکن اس نے پچھلے دنوں آپ کے خلاف اپنی ایک نظم میں نماز نہ پڑھنے کا طعن کیا تھا،
مولانا مسکرائے اور فرمایا:

"شاہ صاحب، جب تک انہیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے۔ اور اگر میں ان کی سیاست کا ہو جاؤں تو پھر اسلام سے میرا لہو و لعب بھی عین اسلام ہو گا۔ انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے۔" (۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک دفعہ مولانا کی نازک مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب فقرہ کہا تھا کہ "آپ کے تلوے میں انسانی سر کا بال آجائے تو پاؤں میں موچ آجائے گی۔ پھر ہفتوں لیٹے رہیں گے کہ بیمار ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ عزیز تخلیہ تھا اور سب سے زیادہ پریشان بھیڑ سے ہوتے۔ وہ عادتاً ملاقاتی طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ ان کا مؤقف تھا۔

فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے۔ (۳)

وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی دہلی میں تھے۔ ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے۔؟"

"مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامئ حیات دو روزے نہ بود و بیش
آں ہم کلیم با تو بگویم چساں گزشت
یک روز صرف بستنِ دل شد باایں و آں
روزے دگر بکندنِ دل زیں و آں گزشت"

تفصیل طلب کیجئے تو مسکرا دیں گے، آغا فہمیدیم اور بس...... لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے۔ مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لئے تخلیہ صحبتِ عیش ہے اور شاہ جی کے لئے جاں کنی،

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

عمر بھر ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے۔ دو چار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی۔ جب ان سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد ہوں شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں ﷺ نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں" (۴)

اسی زمانہ میں ملک فیروز خاں نون نے دہلی میں کہا تھا کہ
"پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز خان و ہلاکو خان بن جائیں گے"
شاہ جی نے وہیں ایک بڑے جلسے میں سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا"
"فیروز خان کو شاید اپنے نام کی مناسبت سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مسلمان ہونے کا گمان ہوا ہے"
اگلے روز شاہ جی مولانا سے ملے تو مولانا نے ایک موضوع اٹھا کر کئی موضوع پیدا کئے۔

دعا دے مجھے اے زمین سخن
کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

مولانا گفتگو کرتے تو الفاظ سلکِ مروارید ہوتے یا رنگا رنگ پھولوں کا سبدہ اور تمام اجزاء طبی نسخے کی طرح ہوتے۔ (۵)

شاہ جی نے فرمایا "مولانا مسلمانوں کے عہدِ گم گشتہ کی ذہانت و فراست کا مجسمہ اور دہلی و بغداد کے علم و نظر کا مرقع ہیں۔ وہ آیتِ ربانی ہیں۔ فی الجملہ وہ مسلمانوں کے گمشدہ اقبال کی ترت پھرت تصویر ہیں۔" (۶)

لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ایک معتقد کارخانہ دار تھے۔ (حاجی دین محمد صاحب مرحوم) انہیں لوہے کی ضرورت تھی اور لوہا ان دنوں مرکزی حکومت کے پرمٹ سے ملتا تھا۔ وہ شاہ جی کو اٹھا کر اور شاہ جی راقم کو لیکر دہلی گئے۔ وہاں بن بلائے مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاہ جی کو اپنے تعلق خاطر پر اعتماد تھا۔ اصرار کیا۔ مولانا انکار کر چکے تھے۔ شاہ جی نہ ٹلے تو مولانا اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اُن کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ شاہ جی کی بات سنی تو آگ بگولہ ہوگئے۔ فرمایا۔

"۱۹۳۷ء سے مسلمان صوبوں کی کانگریسی وزارتوں اور ہندو صوبوں کے مسلمان وزیروں کا انچارج ہوں۔ ان کا محاسبہ ضرور کیا ہے لیکن ان سے سفارش کبھی نہیں کی۔ آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ کیا ہے اور اس کے بعد جھٹ سے اندر لوٹ گئے۔

شاہ جی کے ساتھ مولانا کا سلوک فی الواقعہ غلط تھا، مولانا اگر بے نیاز تھے تو شاہ جی بھی غیرت مند تھے۔ مولانا کے متعلق انہیں اپنے ذہنی اعتماد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ بہر کیف مولانا آزاد اس قسم کی سفارشوں کے معاملے میں آخری عمر تک بے لحاظ تھے۔ (۷)

کرپس مشن کی آمد کے دنوں میں شیخ حسام الدین شاہ جی کی ملاقات کے لئے مولانا سے وقت لے آئے، اڑھائی بجے سہ پہر سے ساڑھے چھ بجے شام تک کا اور یہ شاہ جی سے ہم سخنی کے لئے کافی تھا لیکن شاہ جی گھر ہی سے چالیس منٹ لیٹ چلے، گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے، مولانا کوٹھی کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے،

موٹر ان کا بگڑا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہا:

"ہاں تو ذرا آپ کا موٹر مجھے چھوڑ آئے اور آپ یہاں میری واپسی تک بیٹھیں۔"

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کندھا جھکاتے ہوئے کہا۔

حضرت، شانے حاضر ہیں،

"ہاں میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ (مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا)

تھوڑی سی دیر میں واپس آگئے۔

فرمایا:۔ وائسر یگل لاج تک گیا تھا کرپس سے کہا ہے جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد کیجئے یہاں دہلی میں گرمی کا زور ہو گیا ہے، چنانچہ گفتگو شملہ منتقل ہو گئی ہے۔"

شاہ جی نے پوچھا، حضرت! "غبارِ خاطر" چھپ گئی ہے؟

فرمایا:۔ "ہاں میرے بھائی، لیکن جلد سازی مکمل نہیں ہوئی، کچھ کاپیاں ناشر نے بھجوائی ہیں، ان میں سے ایک جواہر لال کو بھجوادی ہے۔"

عبداللہ کو آواز دی، غبارِ خاطر کی دو کاپیاں لے آؤ،

ایک کاپی شاہ جی کو دستخط کر کے دی، (اس پر مولانا نے لکھا برائے صدیقِ عزیز مسید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ ابوالکلام) دوسری مجھے، اس پر لکھا:

"پیاس خاطر عزیزی عبدالکریم شورش۔"

یہ میرے لئے ایک بڑا افتخار تھا، شیخ حسام الدین پریشان سے ہوئے، مولانا تاڑ گئے، ایک کاپی اور منگوا کے ان کی نذر کی، ہمارے ساتھ نوابزادہ نصر اللہ خاں بھی تھے، انہیں آٹو گراف دیا،

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اب جو ملک کے مختلف مسائل پر باتیں چھڑیں تو گلفشانی گفتار کا نقشہ کھنچ گیا، طبع رواں کا دریا موجیں مار رہا تھا، فرمایا:

"ملک میں غیر ملکی استبداد کا رہنا ممکن نہیں رہا، حکومت کے لئے ایک ہی چارہ کار ہے کہ ہندوستان کی حکومت ملکی نمائندوں کو سپرد کر کے چلی جائے، اب اگر حکومت نے یہاں رہنے پر اصرار کیا تو اس کے نتائج خطرناک ہونگے اس کی حکمرانی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی سا دامن بھی اسے پناہ دینے کے لئے باقی نہیں رہا۔ ساری روک اب اس بات کی ہے کہ جائیں تو کس طرح اور اختیارات منتقل کریں تو کیسے اور کیونکر؟

"لیگ سے کیسے نمٹا جائے گا،" شیخ صاحب نے پوچھا،

"لیگ سے معاملہ تو بہر حال طے ہونا ہے، رہنا تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو ہے، پاکستان

بنالیں تو بھی ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو یہاں رہیں گے اور جن کے لئے یہاں سے اٹھ کے جانا مشکل ہو گا نہ تو پاکستان جو بنے گا۔ اس کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو سمانا اور کھپانا ممکن ہے اور نہ عام لوگوں ہی کے بس میں ہے کہ پاکستان بنتے ہی ان کی آنکھ پاکستان میں کھلے گی، یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے، کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جناح کانگرس سے غایت درجہ بدظن ہیں، ہر چند میں نے چاہا ان سے معلوم کروں کہ مصالحت ممکن ہو تو کس نقطہ پر ہو سکتی ہے یا وہ کس مقام پر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ان کے جواب سے آپ لوگ آگاہ ہیں، گاندھی نے کئی دفعہ کوشش کی، جواہر لال بھی ہو آئے، لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتے، ظاہر ہے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان بھی تقسیم ہو گا۔ جوش و غضب میں ہوش و خرد کہاں رہتے ہیں، اب صورت حال یہ ہے کہ ہر فریق اس کوشش میں ہے کہ پاتا کیا ہے؟ جہاں تک اختیارات کی منتقلی کا تعلق ہے، انگریز چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے، وہ ہندوستان کو واقعی چھوڑ رہے ہیں، کانگریس چاہتی ہے یہ کام اس کی خواہش کے مطابق ہو، اور مصالحت امن سے ہو، لیگ چاہتی ہے کہ اس کا موقف پورا ہو اور بہر قیمت پورا ہو، اختیارات تو کانگرس اور لیگ ہی کو منتقل ہونگے لیکن مفاہمت کے فقدان اور اس سے پیدا شدہ آویزش نے انتقال اختیارات کی نوعیت اور اس کا تعین حکومت کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ظاہر ہے فریقین راضی نہ ہوں تو فیصلہ تیسری جماعت کو دینا پڑتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا..... اس کا مطلب ہے کہ لیگ سے صلح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ مولانا نے فرمایا

"فی الحال تو ناکام ہی ہو گئی ہے۔ آئندہ کامیابی کا امکان نہیں، بلکہ حالات اور خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

شاہ جی نے چاہا۔ مولانا کی طبیعت کا رخ ادبیات کی طرف پھیر دیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ تھکے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعت پر کوئی بوجھ ہے۔ البتہ دو چیزیں جو گھنٹہ بھر کی اس صحبت میں معلوم ہوئیں یہ تھیں کہ:

(۱) صورت حالات سے خوش نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کا نقشہ جو کبھی ان کے ذہن میں تھا ادھورا رہا جا رہا تھا، آزادی آ رہی تھی مگر اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہے تھے جو کچھ ان کا دل محسوس کرتا کھل کے نہیں کہتے تھے، انسانوں میں رہ کر بھی آخر تک انہیں اپنی تنہائی کا احساس اور اس پر اصرار رہا۔

(۲) اس ملاقات سے بہت پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وزارتی مشن کا پلان ان کے ذہن میں تھا، اور وہ چاہتے تھے مسلمان اس کو من و عن قبول کر لیں، اس سے بہتر نتائج پیدا ہونگے، مولانا کے الفاظ جو میری یادداشتوں میں درج ہیں، تقریباً یہ تھے کہ:

"جو حل میں نے تجویز کیا ہے اگر جانبین نے اس کو مان لیا تو جس آنتہا پر سیاسی ہیجان ہے

یا جس سطح پر حالات کھول رہے ہیں اس حل سے وہ پیچان بھی ختم ہوگا اور حالات بھی معمول پر آجائیں گے۔ اس طرح ظن و تخمین، شک و شبہ، اور تکرار و تصادم کا مطلع صاف ہوجائے گا۔"

"وزارتی مشن جو سکیم پیش کر رہا ہے آپ کی ہے؟ شیخ صاحب نے پوچھا،

"نہیں بھائی! سیاسیات میں کوئی خیال، تجویز، نقشہ یا موقف کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ چیزیں باہمی سوچ بچار اور گفت و شنید سے وضع ہوتی ہیں، میں نے ایک خاکہ تجویز کیا تھا، میرا خیال ہے وزارتی مشن نے اس پر صاد کیا ہے، اب اس کی تفصیلات اور جزئیات کا انحصار ان کے اپنے فکر اور اپنی دسترس پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح آخری شکل دیتے ہیں۔

مولانا قدرت کا عطیہ تھے لیکن

مصحفے درمیانِ زندیقاں

پنڈت نہرو ان دنوں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خبر لائے کہ وہ شاہ جی سے ملنا چاہتے تھے اور میں انہیں میر احمد حسن کی دکان پر کل پانچ بجے شام مدعو کر آیا ہوں۔ پنڈت جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے، شاہ جی سے معانقہ کیا ہم سے مصافحہ، میں تھا، شیخ صاحب تھے، ماسٹر تاج الدین انصاری تھے، مولانا حبیب الرحمن تھے اور میر احمد حسن، تعارف ہوا، پنڈت جی کوئی سوا گھنٹہ ٹھہرے، کھل کے باتیں کیں، ہندی سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا، سیاسی بات چیت میں انگریزی ضرور ٹپک پڑتی ہے، مجال ہے کسی اصطلاح یا کسی خیال میں انگریزی کا لفظ آیا ہو، صاف ستھری بے عیب اردو بولتے رہے جیسے کوئی فیصیح لکھنوی ہو، خود الہ آباد کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی زبان اردو تھی۔ چوکس فقرے، روز مرہ کا غازہ، محاورے کی سرخی، سلاست کا زور، دانائی کا عمق، انشاء کی زیبائی، بول چال کی صفائی، غرض اردو ان کی زبان پر قربانت شوم کی صدا دے رہی تھی..... پنڈت جی سیاسی، معاشی اور نجملی مسئلوں پر گفتگو کرتے رہے، انہیں شدید احساس تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اور ہر گفتگو کے بعد مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

"تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے تو مان لیں: "میں نے پنڈت جی سے کہا،

"بظاہر تو ناگزیر ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا حل بھی سامنے آگیا ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن کو ایک خاکہ دیا ہے، شاید اس کے مطابق کوئی صورت نکل آئے، کرپس نے تو مجھ سے یہی کہا کہ وزارتی پلان کے لئے مولانا کی تجاویز ایک عمدہ بنیاد ہیں۔"

"وہ خاکہ کیا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔

پنڈت جی مسکرائے۔ "ہفتہ عشرہ میں سامنے آجائے گا، کوئی چیز بجائے خود راز نہیں ہوتی، صرف وقت کی اڑچن ہوتی ہے کہ اب بیان کی جائے یا وقت پر اور جو چیز راز ہوتی ہے اس کا عوام سے تعلق نہیں ہوتا۔"

شیخ صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا
"جناح کا ماننا اور ہمارا ماننا دونوں بیکار ہوچکے ہیں، اپنی سی سب کوششیں کرلی ہیں۔
ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد بھی پنڈت جی کا یہی خیال تھا کہ بٹوارہ نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کا ماننا اور چیز ہے اور تقسیم کا ہونا دوسری چیز، لیکن ملک تقسیم ہوگیا، پنڈت جی نے اس روز ایک عجیب سا "انکشاف" کیا کہ سکندر حیات نے قرار داد پاکستان کے فوراً بعد انہیں ایک خط لکھا تھا کہ وہ تقسیم کے حامی نہیں ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا آپ نے تو قرار داد لاہور کی تائید کی ہے؟
جواب دیا کہ "اسٹیج کی بات اور ہوتی ہے۔"
شاہ جی نے کہا وہ خط کہاں ہے؟ پنڈت جی نے کہا الہ آباد میں کہیں پڑا ہوگا، آپ ذکر کرنا چاہیں تو میرا نام لے دیں، میں وہ خط آپ کو بھجوادوں گا۔
پنجاب کا ذکر چھڑ گیا تو پنڈت جی جھنجھلا گئے۔
"پنجاب نے ہمیشہ ہی روکاوٹیں پیدا کی ہیں۔!
میں نے کہا۔ "پنڈت جی آپ نے جو لیڈر صوبہ کے لئے منتخب کئے ہیں ان کی سزا عوام کو نہ دیں۔
مسکرائے، "نہیں صاحب، یہ بات نہیں اول تو ہم نے لیڈر منتخب نہیں کئے، لیڈر تو عوام منتخب کرتے ہیں، ہم نے تو انہیں کام سونپا ہے، لیکن پنجاب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک آپس میں چقلی نہ کھائیں یا ایک دوسرے کو گرائیں نہیں، ان کی طبیعت ہی آسودہ نہیں ہوتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر کام رکے رہتے ہیں اور پنجاب کا مسئلہ ہم سب کے لئے دردِ سر بن گیا ہے، کوئی سا گوشہ اطمینان کا نہیں رہا۔"
"یہ پنجاب ہی تھا جہاں راوی کے کنارے آپ کی صدارت میں کامل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہوا اور صدارت کا پہلا شرف آپ نے پنجاب ہی کو بخشا تھا۔" میں نے کہا۔"
"یوں تو پنجاب سے میرا تعلق بہت گہرا ہے، میری والدہ پنجاب کی تھیں۔ لاہور چونے منڈی میں ان کا مکان تھا لیکن پنجاب کا سیاسی مزاج ہمیشہ قابو سے باہر رہا ہے، وہاں سیاسیات سے زیادہ ذاتیات کے جھگڑے رہتے ہیں، ہم نے بہت چاہا کہ احرار کانگرس میں شامل ہو جائیں، صوبہ کانگرس کو دو سال کے لئے معطل کر کے احرار کے حسبِ منشاء ایک کمیٹی بنا دینا چاہی جو صوبائی کانگرس کے ہر کام کی انچارج ہوتی لیکن احرار ہی راضی نہ ہوئے۔"
پنڈت جی نے یہ بات کہہ کر شاہ جی کی طرف دیکھا شاہ جی طرح دے گئے،
پنڈت جی جانے لگے تو میں نے ان سے عجیب سا سوال کیا۔
"پنڈت جی، لوگ آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟"

پنڈت جی مسکرائے............ بھئی یہ بھی کوئی سوال ہے؟
میں نے اصرار کیا تو شاہ جی نے کہا، "یہ لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔" (۸)
پنڈت جی رک گئے۔
"جی نہیں! وجہ یہ ہے کہ لوگ آوارہ گرد ہوتے ہیں اور میں بھی آوارہ گرد ہوں، لہذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

مسلم لیگ نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا وہ گالی گفتار کی انتہاء پر تھا۔ نیازمند قدرتاً اس پر برہم تھے۔ ترجمانِ احرار روزنامہ آزاد (لاہور) بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگا مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا احقر دہلی پہنچا، فرمایا

"زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے نہ بجھ جانے کا
بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے"

لیگ کی اپنی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیئے۔
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو راقم کی موجودگی میں کہا:

"شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الہی ہے۔ اور جو چیز عطیہ الہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیئے۔ جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ آپ کو ان چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگریزے اگلتی اور ریت پھینکتی ہیں۔" (۹)

خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی لیکن ۱۹۲۰ء کا زمانہ لسکے برگ و بار کا زمانہ تھا۔ جس طرح بہار کے موسم میں پھول اگ آتے اور چمنستان لالہ و گلاب سے لاپھند جاتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں سیاسی کارکنوں، سیاسی رہنماؤں اور سیاسی خطیبوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی۔ سارا ملک ان سے متحرک ہو گیا۔ کوئی سی ہندوستانی قوم اس سے خالی نہ رہی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، ہر جماعت میں شخصیتیں ڈھلنے لگیں۔ فی الجملہ یہی زمانہ اردو میں جاندار سیاسی خطابت کا عہدِ آغاز تھا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید دہلوی کے علاوہ خطیبوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی۔ احرار رہنماؤں کی پوری جماعت خطباء کی جماعت تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آغاز میں صرف خطیب تھے۔ ان کی سیادت کا چراغ ان کی خطابت کے چراغ سے مقابلتاً مدھم تھا۔ اردو زبان نے ان سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہ کیا۔ ان میں ید اللہی بانکپن تھا کہ مجمع ہائے عوام کے خیبر آنِ واحد میں سر کر لیتے تھے۔

مولانا آزاد میں محمد علی کی مبارزت، ظفر علی خان کی مقاومت، عطاء اللہ شاہ کی شہامت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔ لیکن وہ ہر رعایت سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا

ہالہ تھی۔ اکثر خطباء وزعماء ان کے محاسنِ خطابت اور محامد نگارش سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قرنِ اول کے فقر و استغناء کی تصویر تھے۔ ہندوستان خطابت میں ان کا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ خود مولانا آزاد نے ان سے متعلق کہا تھا کہ:

"اس باب میں قومی جدوجہد کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے"

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ:

شاہ جی کی باتیں عطاء الٰہی ہوتی ہیں۔"

ان کا حال یہ تھا کہ گاندھی و نہرو سے بھی ایغو کے ساتھ ملتے لیکن مولانا آزاد سے اس طرح ملتے گویا ان کے حضور ہوتے اور ان کی بزرگی سے مرعوب ہیں۔ (۱۰)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس مولانا کے کئی ایک خطوط تھے۔ شیخ حسام الدین کے پاس بھی چند مکتوب تھے۔ لیکن وہ تقسیم کے خرابہ میں ضائع ہوگئے۔ (۱۱)

مجلس احرارِ اسلام کے نوے فیصد زعماء مولانا آزاد اور الہلال کی دعوت پر جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔ (۱۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطابت کے بادشاہ تھے۔ جس طرح الہلال کی صحافت میں قرآن کی آیتیں اور شاعری کے تیر و نشتر ہر پیرے یا فقرے کے موڑ پر ہوتے اسی طرح شاہ جی کی خطابت میں قرآن کا جلال اور شاعری کا جمال ہوتا۔ سامعین ان کے سحر کا شکار ہوتے۔ شاہ جی الہلال کے ذہنی شاگرد تھے۔ الہلال کا جادو تھا کہ سارا ملک اسی کا ہو گیا۔ اس نے خطیبوں اور رہنماؤں کی ایک سیاسی جماعت پیدا کی جس نے استعمار دشمن ہندوستان طیار کیا۔ الہلال کے اس فیضان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلسِ احرار اسلام کے ذہنی پس منظر میں اسلام کے شغف کی حد تک الہلال ہی کے دورِ اول کا ولولہ ہے۔ (۱۳)

علامہ انور شاہ کاشمیری سے متعلق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (رئیس الاحرار) نے بتایا کہ مولانا آزاد دیوبند میں حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی قبروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ علامہ انور شاہ نے دور سے دیکھا تو فرمایا:

"وہ دیکھو علم ٹہل رہا ہے۔"

فرمایا:

"ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"

احرار زعماء الہلال و زمیندار کی پکار پر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۵۳ء میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خان کے دونوں گالوں پر عقیدت کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا"

"ظفر علی خان! تیرے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔"

لیکن مولانا آزاد سے شاہ جی کی ارادت کا یہ حال تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کو ان کی تصنیف کہتے۔ فرماتے:

"الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی ہے۔ الہلال نہ ہوتا تو نہ جانے کب تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں خلاء رہتا"

چودھری افضل حق، احرار کا شہ دماغ تھے۔ شاہ جی انہیں مجلس احرار کا مہاتما کہتے۔ چودھری صاحب مولانا آزاد کو ملک علم کا شہنشاہ اور تدبر کے اعتبار سے بے پناہ کہتے تھے۔ فرماتے:

"ابوالکلام نے مجھے اس راہ پر ڈالا اور شاہ جی نے تھانیدار کی وردی اتروادی"

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا آزاد کو ہمیشہ اپنا مرشد کہا، فرماتے:

"ابوالکلام میں صدیق کا عشق، فاروق کا دبدبہ، عثمان کی حیاء، علی کا استغنا، ابوذر کا فقر اور احمد بن حنبل کی استقامت رچی ہوئی ہے، وہ ان خصائص کا مجسمہ ہیں۔"

شیخ حسام الدین، احرار کا بازو تھے۔ مولانا سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف اختلافی بول تک نہ سنتے۔ کسی زبان پر ایسا کلمہ ہوتا تو اس سے الجھ پڑتے۔ فرماتے:

"ہم لوگ انسانی وجود میں ابوالکلام کی تحریریں ہیں۔" (۱۴)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا آزاد سے متعلق موتی لال نہرو کے یہ الفاظ راقم سے بیان کئے کہ:

"مولانا کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا نہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر ہیں۔" (۱۵)

ایک دفعہ راقم نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں؟"

فرمایا"

"یاد تو نہیں لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا ہے ہم نشین رہا، ہم سفر رہا، (جیل میں اکٹھے رہے) اور بارہا ملاقاتیں کی ہیں۔"

"ان ملاقاتوں کو خود لکھتے، نہیں تو کسی سے لکھوا دیجئے۔ اس طرح ایک عمدہ کتاب ہو جائیگی۔"

"بھائی میں قلم کا آدمی نہیں"

"میں حاضر ہوں آپ بولتے اور سناتے رہیئے میں لکھتا جاؤں گا۔"

"خامہ فرسائی بھی تو ایک روگ ہے، پھر یہ چیزیں سکون دل سے ہوتی ہیں۔ فرصت میں قلمبند کی جا سکتی یا کرائی جا سکتی ہیں۔ آج زمانہ وہ ہے کہ سکون و فرصت دو نوعنقا ہیں۔"

"اس طرح ان گفتگوؤں کے اکارت ہو جانے کا احتمال ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے کے اس قحط الرجال میں سب سے بڑا عبقری ہے اس کی گفتگوئیں قلمبند کرنا آئندہ نسلوں کی ایک امانت انہیں سونپنا ہے۔"

"ہاں بھائی ٹھیک ہے، لیکن مولانا کی زبان کہاں سے لاؤں ہم لوگ مولانا کے افکار کے سوانح ہیں۔ شاہ جی ٹال گئے لیکن صبح و شام کی یکجائی کے باعث مولانا کا ذکر چھڑا رہتا، کئی باتیں معلوم ہوتیں، مولانا کے عظیم فقرے شاہ جی کے نوکِ زباں تھے۔

شاہ جی نے فرمایا:

"احرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورے پر رکھی گئی۔ لیکن ہم لاہور میں وہ گلگتے ہیں، ہم جلوت کے وہ خلوت کے، انہیں ملنا سرخ گندھک ڈھونڈ لانے کے مصداق تھا، ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی فاصلہ تھا۔ ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے۔ اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احرار الہلال کی بازگشت ہیں۔"

"مولانا مسلمانوں سے اس قدر مایوس کیوں ہیں؟" راقم نے شاہ جی سے پوچھا۔

فرمایا:

وہ تو نہیں لیکن مسلمان ان سے مایوس ہیں۔ مولانا نہ ان کی سطح پر اترتے ہیں اور نہ ان کے دماغوں کی پستیوں سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ مسلمان شاعری کی پیداوار ہیں، وہ لیڈر شپ سے اپنی خواہشوں کا اتباع چاہتے اور خود لائحہ عمل تجویز کر کے اسے تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے بعد مسلمانوں کی لیڈر شپ سرکاری امراء کی تحویل میں چلی گئی، اور وہ اجتماعی طور پر بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں، تعلقہ داروں اور تمنداروں کی ملکیت ہوگئے، مسلمان زندہ ہوتے تو مولانا مایوس نہ ہوتے اور مولانا تعلقہ دار ہوتے تو مسلمان اُن سے بد دل نہ ہوتے۔"

"مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"مولانا چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہر جہتی اعتراف مفقود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام کانگرس کی سب سے بڑی فراست کا نام ہے وہ کانگرس کو طوفانوں سے نکالتے اور مخالفین کے دلوں میں اتارتے ہیں۔"

شاہ جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مسلمانوں نے انہیں کربلا میں کھڑا کیا ہے ان کے لئے مسلمانوں کی اکثریت فرات کا کنارہ ہے، آج مسلمان صرف مسلمان ہوتے اور انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوتا تو ان کی عقیدت کا مرجع ہوتے، یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ جس ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا اس ہندوستان کی آزادی کے لئے ابوالکلام انگریزوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو کو اپنی

متاع سمجھتے ہیں اور مسلمان اردو پر سیاستہً پیچھے جاتے ہیں گو مجھے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی اس عصبیت کے باعث اردو نہ صرف ہندوستان میں زخم کھائے گی بلکہ ایک عظیم ابتلاء کا شکار ہو گی۔ لیکن مولانا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندوں سے، کہ ان کی زبان ہی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے، اردو مین مذاکرات کرتے اور اردو میں، ہمکلام ہوتے ہیں۔ افسوس نہ بابائے اردو اس پر فخر کرتے اور نہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی بات ہی سہی لیکن جذباتی قوم جب سیاسی طور پر نابینا ہو جائے تو وہ حسن پر قبح کو ترجیح دیتی اور زیاں پر سود کا گمان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سرگزشت انہی حادثوں سے اٹی ہوئی ہے۔"

شاہ جی نے کہا..... ابوالکلام:

۱- اس زمانے میں ملتِ اسلمیہ کے سب سے بڑے عبقری ہیں اور فی الواقعہ ابوالکلام ہیں۔

۲- ان کا وجود قدرت کا عطیہ اور ان کا دماغ معجزہ الٰہی ہے۔

۳- وہ مسلمانوں کی اس لیڈر شپ کے میر قافلہ ہیں۔ جو تحریک خلافت کے زمانے میں ابھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہو گئی اور اب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں سرگرم جہد ہے۔

۴- وہ قرن اوّل کے حجاز کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو گئی۔

۵- ان کے ذہنی کمالات صرف اس وجہ سے عوام میں نہیں آتے کہ مسلمان ہیں، مسلمان انہیں مانتے نہیں اور ہندوؤں کے لئے ایک مسلمان کی پوجا (ورشپ) کیونکر ممکن ہے؟

۶- وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستخیز تھے، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خوان کی نہیں بزم کے نغمہ خوان کی ضرورت رہی ہے اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے ہیں۔

۷- مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لیتا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیا بانوں کی سمت مڑ جاتی۔ (۱۶)

---

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، صفحات ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳

(۲) ایضاً صفحہ ۵۱

(۳) ایضاً صفحہ ۵۲

(۴) (سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۱۹-۱۶-۱۵)

(۵) مولانا ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، صفحہ ۵۹

(۶) ایضاً صفحہ ۶۹، ۷۰

(۷) ایضاً صفحہ ۸۲، ۸۳

(۸) بوئے گل نالہ دل، از شورش کاشمیری صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۸

(۹) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری صفحہ ۸۹

(۱۰) ایضاً، صفحات ۲۴۳ تا ۲۴۵

(۱۱) ایضاً صفحہ ۳۶۵

(۱۲) ایضاً صفحہ ۴۰۵

(۱۳) ایضاً صفحہ ۴۱۵

(۱۴) ایضاً صفحہ ۴۵۸، ۴۵۹

(۱۵) ایضاً صفحہ ۴۶۱

(۱۶) ایضاً صفحہ ۴۹۳ تا ۴۹۶